مطبوعات

Muslim Thought And Its Source

تالیف جناب سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات قیمت لعہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دی گریٹ ایسٹرن لائبریری ۱۵ کالج اسکویر۔ کلکتہ۔

یہ کتاب مغربی مصنفین کے اس دعوے کی تردید میں لکھی گئی ہے کہ مسلمانوں میں فکری نشو و نما کی ابتدا یونانی عقلیات کے مطالعہ سے ہوئی اور ان کے تمام معقولات اسی سرچشمے سے ماخوذ تھے۔ مؤلف نے اس ادعائے غلط کا ابطال کرنے کے لیے سب سے پہلے مجملاً یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو غور و فکر اور تحقیق و تجسس پر ابھارنے والی چیز دراصل حکمت یونان نہیں بلکہ تعلیم قرآن تھی اور اس تعلیم کے اثر سے انہوں نے مسائل حکمت پر اس وقت سوچنا شروع کر دیا تھا جب یونانی علوم کے متعلق وہ کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس اجمال کے بعد مؤلف نے تفصیل کا طریق اختیار کیا ہے۔ ابتدائی فکری حرکت نے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں جو راہیں اختیار کیں، ان میں سے وہ چار بڑی بڑی راہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اعتزال، اشعریت، تصوف اور حکمت یعنی فلسفہ و سائنس۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر علٰحدہ علٰحدہ بحث کرتے ہیں۔ پہلے تین مذاہب کے متعلق انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ان کی اصل یونانی نہیں بلکہ خالص اسلامی ہے۔ اگرچہ ان مذاہب کے متبعین نے آگے چلکر یونانی اور عجمی علوم سے استفادہ ضرور کیا، لیکن جن مسائل پر انہوں نے بحث کی وہ سب کے سب قرآن کے مطالعہ سے پیدا ہوئے تھے، اور ان کے استدلال کی بنا بھی قرآن ہی پر قائم تھی۔ رہی آخری چیز تو وہ بلاشبہ دوسری قوموں سے مسلمانوں میں آئی مگر مسلمان محض دوسروں کے مترجم اور شارح نہ تھے، جیسا کہ مغربی مصنفین کا گمان ہے، بلکہ انہوں نے عقلیات اور طبیعیات کا جس قدر ورثہ دوسروں سے پایا اس

بہت زیادہ دوسروں کے لیے چھوڑا۔

یہ تمام مباحث جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں اردو زبان میں اس سے پہلے بارہا آچکے ہیں مگر انگریزی میں شائد اب تک کسی نے ان کو اتنی تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کیا تھا۔ اس لحاظ سے یقیناً مؤلف کی خدمت قابل قدر ہے لیکن ضرورت تھی کہ ان مباحث کو مولانا شبلی اور جسٹس امیر علی اور ان کے عہد کے لوگوں نے جہاں چھوڑا تھا، مؤلف اس مقام سے آگے بڑھتے اور زیادہ گہری نظر سے مسلمانوں کے علوم عقلیہ کا مطالعہ کرکے دنیا کو یہ بتلاتے کہ افکار انسانی کے نشو و ارتقا میں دراصل مسلمانوں کا حصہ کتنا اور کیسا ہے، اور وہ خاص اسلامی عنصر کونسا ہے جس نے فکر و نظر کے ہر گوشہ میں اپنا اثر ظاہر کیا۔ ایک مغربی مصنف (O'leary) نے اس موضوع پر ایک کتاب Arabic Thought And Its Place In History کے نام سے لکھی ہے، مگر وہ غریب خود فکر اسلامی سے ناآشنا تھا۔ اس لیے وہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہ کرسکا۔ یہ فرض دراصل مسلمانوں ہی کے ذمہ واجب الادا ہے، اور اس سے وہی لوگ اچھی طرح سبکدوش ہوسکتے ہیں جنہوں نے علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ دونوں کی تعلیم حاصل کی ہے۔

کتاب میں چند باتیں اصلاح طلب بھی ہیں جن پر امید ہے کہ دوسری اشاعت کے موقع پر نظرثانی کی جائے گی۔

قرآن مجید میں جس چیز کو لفظ "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے وہ نہ تو انگریزی لفظ (Rationalism) کی ہم معنی ہے اور نہ (Free thinking) کی۔ انیسویں صدی کے مسلمان مصنفوں نے محض اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھاکر قرآن کی حکمت کو حکمت بمعنی جدید سے ملادینے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اس وقت کی بات تھی جب ہماری جدید علمی تحریک اپنے عہد طفولیت سے گذر رہی تھی۔ اب نسبتہً بلوغ کا زمانہ ہے اور ہمارے محققین کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنے استدلال کی عمارت ایسی کمزور بنیادوں پر اٹھائیں۔

اعتزال کے لیے (Rationalism) اور اشعریت کے لیے (Scholasticism) کی

اصطلاحیں بھی درست نہیں۔ انگریزی پڑھنے والوں کے ذہن ان اصطلاحوں سے جن مفہومات کی طرف منتقل ہوں گے وہ اعتزال اور اشعریت کی خصوصیات سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ فاضل مؤلف نے اعتزال اور اشعریت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے شبہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خود بھی ان دونوں مذاہب کی حقیقت پر اچھی طرح غور نہیں کیا ہے، اور زیادہ تر مولٰنا شبلی مرحوم کی کتابوں پر اعتماد کر کے ایک رائے قائم کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے نہ صرف اصطلاحوں کے استعمال میں غلطی ہوئی ہے، بلکہ ان کے بیان کا پلڑا ہر جگہ اعتزال کی طرف جھک گیا ہے۔ وہ معتزلہ کو "مسلمان مفکرین کا سب سے زیادہ ریشنلسٹ گروہ" سمجھتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اشعریت کو ایک ارتجاعی (Reactionary) تحریک قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اعتزال ہمیشہ خام فلسفیت سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو اعتزال رونما ہوا وہ بھی دراصل خام فلسفیت ہی کا نتیجہ تھا۔ جب تک مسلمانوں میں عقلیات کا مطالعہ محض سطحی رہا اور تنقید کا مادہ پیدا نہ ہوا اس وقت تک علم کلام میں اعتزال کا اور فلسفہ و طبعیات میں حکمائے یونان سے مرعوبیت کا دور دورہ رہا۔ مگر جب چوتھی اور پانچویں صدی میں بلوغ کا عہد آیا اور زیادہ گہری نظر رکھنے والے مفکرین پیدا ہوئے تو انہوں نے کلام اور فلسفہ اور منطق پر تنقید شروع کر دی اور ایک ایک کر کے ان غلطیوں کے پردے چاک کرنے شروع کر دیئے جو ابتدائی دور کے متکلمین اور حکماء نے کی تھیں۔ اشعریت اس دور تنقید کی محض ایک ابتدائی چیز تھی اس لیئے خام نظر آتی ہے۔ آگے چل کر امام غزالی امام رازی، علامہ ابن تیمیہ اور دوسرے لوگوں نے جب عقلیات اسلامی کو کمال پر پہونچایا تو اعتزال طبعی موت مر گیا اور اشعریت کی صورت بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔

مؤلف نے ایک طرف تو اعتزال کو "ریشنلزم" کا ہم معنی قرار دیا ہے، اور دوسری طرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ریشنلزم" کی روح خود صحابہ اور تابعین کے گروہ میں پیدا ہو چکی تھی۔ اس سے ایک شخص یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین میں بھی کچھ لوگ اعتزال کی طرف میلان رکھتے تھے، حالانکہ

یہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ کے متعلق مؤلف نے وثوق کے ساتھ لکھدیا ہے کہ وہ معراج جسمانی کی قائل نہ تھیں حالانکہ یہ کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔ ابن ہشام نے اس روایت کو محمد بن اسحاق سے لیا ہے اور محمد بن اسحاق نے اپنے ذریعۂ علم کی تصریح نہیں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے خاندان ابوبکر کے کسی شخص نے ایسا کہا تھا۔ مگر ان کا زمانہ حضرت عائشہ سے اس قدر بعید ہے کہ خاندان ابوبکر کے جس شخص نے بھی ان سے یہ روایت بیان کی ہوگی وہ بہر حال ایسا شخص نہ ہوگا جس نے ام المومنین کی صحبت پائی ہو۔ لہٰذا اس کے اور حضرت عائشہ کے درمیان ایک واسطہ اور چھوٹ جاتا ہے۔ پس یہ روایت ایسی ہے جس کا ایک راوی بیچ سے غائب ہے، اور ایک راوی مجہول ہے۔ کیا ایسی کمزور روایت کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ام المومنین کا یہی مسلک تھا؟ یہ دراصل انیسویں صدی کے معتزلہ کی خصوصیت تھی کہ وہ اپنے مسلک کی تائید میں ہر چھوٹے سے چھوٹے تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے معراج کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تو یہ روایت ان کے ہاتھ لگی اور انہوں نے بہت غنیمت سمجھ کر اس کو لے لیا۔ مگر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وہ طفولیت کا زمانہ تھا بچپن کی باتیں اس وقت نبھ جاتی تھیں۔ اب اس دور بلوغ میں ارباب تحقیق کو زیب نہیں دیتا کہ ایسے کمزور سہاروں پر استدلال کی بنیاد اٹھائیں۔

قانون بین الممالک تالیف مولوی محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعۂ عثمانیہ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ۴ ر۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب بین الاقوامی قانون یا باصطلاح مؤلف "قانون بین الممالک" پر درسی اغراض کے لیے لکھی گئی ہے۔ مؤلف کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اردو کے لیے یہ موضوع بالکل نیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک شخص بین الاقوامی قانون کے شعبۂ جنگ پر تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہے۔

ہم کو سب سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ مولف نے اُن توقعات کو پورا کیا ہے جو ایک مسلمان محقق سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اہل یورپ نے بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب کا سبق مسلمانوں سے حاصل کیا اور ایک نہایت ترقی یافتہ بین الاقوامی قانون مرتب صورت میں ان سے پایا، مگر ان کی احسان فراموشی نے اتنی بھی اجازت نہ دی کہ وہ بین الاقوامی تعلقات کے نشو و نما کی تاریخ میں کہیں مسلمانوں کے حصہ کا اشارۃً ہی اعتراف کرتے۔ اب یہ کام ایک مسلمان مصنف ہی کا ہو سکتا تھا کہ وہ اس موضوع پر کچھ لکھتے وقت اسلامی قوانین کو فراموش نہ کرتا۔ چنانچہ ہمیں مسرت ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب میں اس حقیقت کو اچھی طرح ظاہر کر دیا کہ موجودہ قانون بین الاقوام کے اصلی بانی مسلمان ہیں نہ کہ اہل یورپ، اور یہ کہ مسلمانوں کے پاس بین الاقوامی تعلقات کا ایک مکمل ضابطہ اس وقت موجود تھا جب یورپ میں اس کا تصور بھی پیدا نہ ہوا تھا۔

ایک بات خصوصیت کے ساتھ ہماری نظر میں کھٹکی اور وہ یہ ہے کہ مؤلف نے وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ کا ترجمہ "اور رام راج قائم ہو" کیا ہے۔ کیا "رام" لفظ اللہ کا ترجمہ ہے اور ایک مسلمان یہ ترجمہ کر سکتا ہے؟ اردو کو ہندی سے ملانے کی تحریک سیاسی حیثیت سے خواہ کتنی ہی مناسب ہو مگر اس کو اتنا نہ پھیلائیے کہ خدا اور اللہ کی جگہ "رام" لے لے۔

کتاب میں حیدرآباد کی بین الاقوامی حیثیت پر جو بحث کی گئی ہے وہ بڑی حد تک بے جوڑ محسوس ہوتی ہے۔ بین الاقوامی قانون اس سے بحث نہیں کرتا کہ فلاں ملک کی پوزیشن کیا ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ وہ صرف اس امر سے بحث کرتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں اس کی پوزیشن فی الواقع کیا ہے۔ مؤلف نے اس بحث میں پڑ کر اپنے حب وطن کا ثبوت تو ضرور دیا ہے، مگر جس فن پر وہ کلام کر رہے ہیں اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

ابن مریم [تالیف جناب خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب ایم اے پنشنر سشن جج۔ ۲۔ فرید کوٹ لاہور۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت ۸ مؤلف سے اوپر کے پتے پر مل سکتی ہے۔

فاضل مؤلف نے اس سوال پر بحث کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کی حیات وممات اور ان کے معجزات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس بحث میں انہوں نے قرآن سے باہر کی کسی چیز سے مدد نہیں لی ہے بلکہ صرف قرآن ہی کے الفاظ اور ان کے سیاق وسباق اور آیات کے نظم سے متنازع فیہ آیات کے معانی متعین کیے ہیں۔ یہ بحث بہت دلچسپ ہے اور ایک اچھے تربیت یافتہ قانونی دماغ سے جس سلجھے ہوئے طرز بیان و انداز استدلال کی ہم توقع رکھتے ہیں وہی اس میں ابتدا سے انتہا تک نمایاں نظر آتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں مؤلف نے تفسیر و تاویل کے اصول پر بھی کلام کیا ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر فائدے سے خالی نہیں۔

حروف مقطعات کے اشارات و کنایات | تالیف جناب خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب ضخامت ۹۸ صفحات۔ قیمت ۱ر۔ مؤلف سے مذکورۂ بالا پتہ پر مل سکتی ہے۔

حروف مقطعات کا مسئلہ مفسرین قرآن کے لیے ہمیشہ سے ایک لاینحل مسئلہ رہا ہے۔ خدا اور رسول نے ان کی کوئی تاویل ہم کو نہیں بتائی اور خود ہم اپنی عقل سے اگر کوئی تاویل کریں تو ہمارے پاس یہ اطمینان کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہماری تاویل صحیح ہے اسی بنا پر جمہور نے سکوت ہی مناسب سمجھا ہے لیکن بعض مفسرین نے تاویل کی کوشش بھی کی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تاویل کرنے والا اپنی تاویل کی یقینی صحت کا دعویٰ نہ کرے۔

حاجی رحیم بخش صاحب نے اس مختصر میں حروف مقطعات سے معنی نکالنے کا ایک عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ عربی حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے حروف کے اعداد معین کرتے ہیں مثلاً ص چودھواں حرف ہے اس لیے اس کا عدد ۱۴ ہے اور ق اکیسواں حرف ہے اس لئے اس کا عدد ۲۱ ہے۔ پھر جس سورۃ میں مثلاً حرف ص آیا ہے اس کے مضمون پر وہ نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں ایک مخالف اسلام گروہ کے شکست کھانے کی پیشین گوئی ملتی ہے (جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ) اس کے بعد وہ تاریخ پر نظر ڈالتے

ہیں تو یہ واقعہ ملتا ہے کہ بعثت کے چودھویں سال جنگ بدر پیش آئی جس میں کفار کو شکست نصیب ہوئی۔ پھر ان تینوں حقیقتوں کے درمیان ربط پیدا کرکے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سورہ ہ کی ابتدا میں حروف تہجی کے چودھویں حرف یعنی ص کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ نے واقعہ بدر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہی اسلوب انہوں نے تمام حروف مقطعات کے بارے میں اختیار کیا ہے اور ان سے آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں نکالی ہیں۔ ممکن ہے کہ قرآن کے بے شمار اعجازی پہلوؤں میں سے یہ بھی ایک پہلو ہو، مگر جیسا کہ مؤلف کو خود اعتراف ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد حقیقۃً وہی تھی جو مؤلف نے سمجھی ہے۔

سلسلۂ تعلیم القرآن | تالیف مولوی محمد عماد الدین صاحب انصاری فاضل دیوبند۔ قیمت حصہ اول ۴ر حصہ دوم ۴ر ملنے کا پتہ: کتب خانہ انصاریہ، بازار شیخاں جالندھر۔

یہ سلسلہ بچوں اور کم سواد لوگوں تک قرآن کی تعلیم پہنچانے کے لیے لکھا گیا ہے۔ ایک خاص ترتیب کے ساتھ قرآن کی آیات جمع کی گئی ہیں جن سے عقائد اور احکام اور اخلاقی تعلیمات پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ ہر آیت کے نیچے عام فہم ترجمہ دیا گیا ہے۔ حاشیہ پر مضامین کی تشریح ہے اور کتاب کے آخر میں لغات قرآن کو حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کرکے ان کے معنی درج کر دیے گئے ہیں۔

گلدستۂ تعلیم اسلام | تالیف مولوی محمد عماد الدین صاحب۔ قیمت: قاعدہ ۱ر حصہ اول ۴ر حصہ دوم ۵ر حصہ سوم ۶ر، حصہ چہارم ۶ر ملنے کا پتہ وہی جو اوپر مذکور ہوا۔

یہ سلسلہ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے لکھا گیا ہے۔ قاعدہ تو اسی طرز کا ہے جس پر قدیم قاعدے لکھے گئے ہیں۔ بعد کی کتابوں میں اسلامی عقائد، سیرت نبوی، احوال صحابہ اور احکام فقہیہ کو ایک خاص ترتیب و تدریج کے ساتھ جمع کیا گیا ہے اور اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ بچہ جتنا جتنا بڑا ہوتا جائے اس کے سامنے دینی معلومات کی اتنی ہی زیادہ تفصیلات آتی جائیں۔ طریق تعلیم اچھا ہے، مگر زبان میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے جو کتابیں لکھی جائیں ان کی زبان صحیح ہونی چاہیے تاکہ دینی تعلیم کے ساتھ ان کی ادبی تعلیم بھی مکمل ہوتی جائے

رسول مقبول | تالیف جناب مولانا عتیق احمد صاحب صدیقی مدیر قاسم العلوم۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت ۵/
ملنے کا پتہ:۔ مجلس دارالتالیف، دیوبند۔

یہ کتاب بچوں کی تعلیم کے لیے ہے سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو اسباق کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور ہر سبق کے آخر میں اس کا خلاصہ دے کر مشقی سوالات لکھے گئے ہیں، زبان سہل اور عام فہم ہے مگر کہیں کہیں پایۂ ادب سے گری ہوئی ہے مثلاً متعدد مقامات پر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لیے صیغۂ واحد استعمال کیا گیا ہے (خدیجہ بہت خوش ہوئی"۔ "اُن کے دل میں آپ کی قدر و منزلت قائم ہوگئی" وغیرہ) یہ انداز بیان ادب کے خلاف ہے اور خصوصاً بچوں کو تو اس سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

کتاب میں اور بھی چند مقامات پر اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، مثلاً پہلے ہی سبق میں پیغمبر کی ضرورت جس طریق استدلال سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے وہ بہت ناقص ہے۔ اس سے ایک بچہ اس غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے کہ ہر زمانہ میں ایک نبی کا آنا ضروری ہے اور باب نبوت کو ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق لکھا ہے کہ وہ طوفان نوح سے ۳۹۱۳ برس بعد اور پیدائش آدم سے ۶۱۵۵ برس بعد ہوئی۔ اول تو اس تفصیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسرے یہ تقویم سر تا سر یہودی روایات پر مبنی ہے جس کا کوئی ثبوت نہ اسلامی روایات میں ملتا ہے اور نہ تاریخی شواہد میں۔ ایسی ظنی اور غیر معتبر چیزوں کو نصاب درس میں بیان کرنے سے کیا فائدہ متصور ہے؟ بچے سمجھتے ہیں کہ یہ اسلامی روایات ہیں پھر بڑے ہو کر جب وہ تاریخ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔

سفر شام کے سلسلہ میں بحیرا راہب کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ روایت متعدد حیثیات سے ناقابل اعتبار ہے۔ اور دشمنان اسلام نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر نبوت محمدیؐ پر بہت سے شکوک وارد کیے ہیں کیا ضرورت ہے کہ اس قسم کی کمزور روایتیں بچوں کے سامنے بیان کی جائیں اور ان کے اندر دشمنوں کے اعتراضات سے متاثر ہونے کی استعداد پہلے ہی سے پیدا کر دی جائے۔